بسنت ایک خونی تہوار!

مولانا محمد طفیل کوہاٹی

اللہ تعالیٰ ہمیں غلامی کے عذاب سے محفوظ رکھے، انسان کا جسم غلام ہو یا ذہن، دونوں اس کی تباہی کا ذریعہ بن جاتے ہیں، حتیٰ کہ انسان اپنا ذاتی وقار و وجاہت، اپنا دین و مذہب، اپنی تہذیب و ثقافت بلکہ اپنا نسب تک بھول جاتا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں بہت سے طبقے کچھ ایسی ہی راہوں پر چل نکلے ہیں اور اپنے ساتھ بہت سے بدعقلوں کو بھی ہنکا رہے ہیں۔ بسنت کی شکل میں ان کا اُٹھایا ہوا طوفان اس وقت ہمارے معاشرے میں زوروں پر ہے، بے پایاں سرمایہ بلا فائدہ اس پر خرچ ہو رہا ہے، جب کہ دوسری طرف یہ بہت سی قیمتی زندگیوں کو بھی برباد کر رہا ہے، کئی معصوم بچوں، راہ چلتوں اور غریب مزدوروں کی جانیں پتنگوں کی دھاتی ڈوروں کا نشانہ بن چکی ہیں۔ ہر سنجیدہ انسان ان دگرگوں حالات کو دیدۂ خونبار سے دیکھ رہا ہے اور ہر پاکستانی کی یہ دلی خواہش ہے کہ اس عذاب سے چھٹکارا حاصل ہو۔

بسنت اور پتنگ بازی خالص ہندوانہ تہوار ہے، تاریخی شواہد ملاحظہ کرنے کے بعد اس کا اندازہ انتہائی آسانی سے ہو جاتا ہے۔ آیئے! ذرا تاریخی حوالوں کی روشنی میں بسنت کا جائزہ لیتے ہیں۔

بسنت کی ابتدا

قدیم ہندوستانی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بسنت کا آغاز پہلے پہل ہندوستان کے دو صوبوں پنجاب اور اتر پردیش میں ہوا۔ یہ تہوار بہار کے اوائل میں منایا جاتا تھا، اس وقت سرسوں کی فصل عین شباب کی حالت میں ہوتی اور زرد پھولوں سے سارے کھیت ڈھکے نظر آتے۔ اسی مناسبت سے تہوار منانے والے پیلے رنگ کے کپڑے پہنتے۔ مؤرخین کا کہنا ہے: ''اس کا قدیم تصور موسم سے وابستہ ہے، چونکہ ان دنوں موسم تبدیل ہوتا ہے اور موسم بہار کی آمد آمد ہوتی ہے، لہٰذا لوگ استقبالِ بہار میں گھروں سے باہر نکل آتے اور میلے منعقد کرتے تھے۔ یہ تہوار پہلے پہل ہریانہ اور پنجاب میں فروری اور مارچ کو منایا جاتا تھا، ہریانہ کے علاقے میں سرسوں کے بڑے بڑے کھیت قالین کی طرح بچھے ہوتے تھے، لوگ بھی پیلے کپڑے پہنتے اور پتنگ اُڑاتے، گھروں میں لوگ مخصوص پوجا کرتے اور ماتھے پر ٹیکہ لگاتے، لوگ میٹھے چاول پکاتے اور ان میں سے پیلا رنگ ڈالتے، مرد پیلے کپڑے پہنتے اور عورتیں پیلی اوڑھنیاں اوڑھتیں۔''

ہندو مصنف ''منشی رام پرشاد ماتھر'' لکھتا ہے:

''بسنت پنچمی: اب فصل کے بار آور ہونے کا اطمینان ہو چلا ہے اور کچھ عرصہ میں کلیاں کھل کر تمام کھیت کی سبزی زردی میں تبدیل ہونے لگے گی، اس لیے کاشتکار کے دل میں امنگ اور خوشی پیدا ہوتی ہے، وہ زردیوں کو خوش خوش گھر لا کر بیوی بچوں کو دکھاتا ہے اور پھر سب مل کر بسنت کا تہوار مناتے ہیں اور زرد پھول اپنے اپنے کانوں میں بطور زیور لگاتے ہیں۔'' (ہندو تہواروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت، ص:۱۰۱)

''منشی رام پرشاد ماتھر'' لکھتا ہے:

''بسنت پنچمی کا تہوار گجرات، پنجاب، ممالک متحدہ اور راجپوتانہ وغیرہ میں زیادہ منایا جاتا ہے، دکن میں بہت کم ہوتا ہے، وہاں امیر لوگ گاتے بجاتے ہیں اور مندروں میں تسو ہوتا ہے، راجپوتانہ میں بسنتی کپڑے پہنے جاتے ہیں، بنگالہ میں اس کو سری پنچمی کہتے ہیں اور سرستی کی پوجا کرتے ہیں، شام کو بچے قسم قسم کے کھیل کھیلتے ہیں اور دوسرے دن سرستی کی مورتی کسی تالاب میں ڈال دیتے ہیں، اس روز کہیں کہیں ''کامدیو'' اور اس کی بی بی رتی کی پوجا ہوتی ہے۔'' (ہندو تہواروں کی دلچسپ اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت، ص:۲۳۵)

امریکن میوزیم آف نیچرل ہسٹری کی آفیشل ویب سائٹ پر ''میننگ گاڈ'' کے کالم میں لکھا ہے:

''سرسوتی (ہندوؤں کی مقدس دیوی) کو شمالی بھارت میں بسنت پنچمی کے تہوار پر پوجا جاتا ہے، یہ تہوار ہندو مہینے مگھ (جنوری، فروری) میں ہوتا ہے اور خاندان اپنی اپنی پوجا کرتے ہیں۔'' (بسنت کیا ہے؟، ص:۸۷)

معروف سیاح البیرونی اپنے سفرنامہ ہند میں لکھتے ہیں:

''اسی مہینے میں استواء ربیعی ہوتا ہے جس کا نام بسنت ہے، حساب سے اس وقت کا پتہ لگا کر اس دن عید کرتے اور برہمنوں کو کھلاتے ہیں۔'' (کتاب الہند، ص:۲۳۸)

ان تحریرات سے واضح ہوتا ہے کہ بسنت کا یہ میلہ خالص ہندو ثقافت کا حصہ ہے، جسے وہ پہلے پہل موسمی تہوار کے طور پر مناتے تھے، بعد ازاں اُسے مذہبی شکل مل گئی اور یہ ہندوؤں کے ہاں ایک خالص مذہبی تہوار بن گیا، حتیٰ کہ اُسے سرکاری سرپرستی حاصل ہوئی اور اُسے خوب رواج دیا گیا۔ پھر یہ ایک مذہبی یادگار بن گیا اور ہندو قوم اُسے اپنا مذہبی شعار سمجھ کر منانا شروع ہوئی۔ یہ اتنا اہم مذہبی تہوار کیسے بنا؟ اس کہانی کو پڑھنے سے پہلے ذرا پتنگ بازی کی تاریخ سے پردہ ہٹاتے ہیں جو کہ بسنت کا ایک لازمی اور ضروری جزو سمجھا جاتا ہے۔

پتنگ بازی کی تاریخ

کہا جاتا ہے کہ چائنیز جنرل ''ہن سن'' جو ایک ماہر جنگی جرنل سمجھا جاتا تھا، نے سب سے

پہلے انڈیا اور بعض ملحقہ علاقوں میں اپنے دشمنوں کی جاسوسی کے لیے پتنگ بازی کا استعمال شروع کیا تھا۔ یہ کوئی ۲۰۰ ق م کا واقعہ ہے، وہ باریک کاغذ کے پتنگوں کے ساتھ کوئی مخصوص آلہ نصب کرتا، پھر اپنی سرحد سے دشمن کے علاقوں کی طرف پتنگ اڑا دیتا اور اس کے ذریعے دشمن کے ٹھکانے معلوم کرنے کی کوشش کرتا۔ ۲۰۰ ق م میں پتنگ کا اس طرح استعمال بظاہر ایک عجیب سا امر ہے، لیکن بہر حال یہ ایک تاریخی روایت ہے جسے بلا دلیل آسانی سے رد بھی نہیں کیا جا سکتا۔ چینیوں کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ انہوں نے پتنگ ۴۰۰ ق م میں پہلی دفعہ چین میں بنائی اور اُڑائی، اس کے بعد یہ پتنگ بازی چین کی ملکی تقریبات اور تہواروں میں شروع ہوگئی، پھر رفتہ رفتہ اُسے باقاعدہ کھیل کی شکل دے دی گئی۔ شاہی خاندان پتنگ سازوں کی حوصلہ افزائی کرتا اور پتنگ بنانے والوں کو شاہی درباروں میں ماہرین کا عہدہ اور رتبہ دیا جاتا۔ اس دعویٰ کے مطابق چین میں پتنگ کے ایجاد کے ۲۰۰ سال بعد ہی اس کا جنگی استعمال ہوا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چینیوں نے سرکاری سرپرستی میں مسلسل پتنگ سازی کو توجہ دیئے رکھی اور بالآخر وہ اُسے ایک بڑے مقصد کے لیے استعمال کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

مصریوں کا کہنا ہے کہ پتنگ سازی کا کاروبار فراعین مصر کے دور میں بھی موجود تھا، اس کے لیے وہ اہراموں سے برآمد ہونے والی تصاویر اور بت بطور دلیل پیش کرتے ہیں، جن میں بادشاہوں کو پتنگ اڑاتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مصریوں کا کہنا ہے کہ پتنگ سازی کا فن مصر کے تاجروں کے ذریعے چین پہنچا۔ مصر میں یہ شاہی کھیل سمجھا جاتا تھا اور عوام کو کھیلنے کی اجازت نہ تھی، جبکہ چینی بادشاہوں نے اُسے عام کر دیا تھا، اس لیے یہ چین میں زیادہ پھیلا۔ اگر مصریوں سے پتنگ بازی کی ابتدا والی روایت درست ہو تو پھر پتنگ کی تاریخ پانچ ہزار سال پرانی تسلیم کرنی پڑے گی۔ بہر حال چین سے پتنگ بازی کا سلسلہ ہندوستان تک پہنچا اور پھر ہندوؤں نے اُسے اپنے تہواروں میں جگہ دینا شروع کر دی، یہاں تک کہ یہ بسنت کا ایک لازمی جزو بن گیا۔

پتنگ اُڑانا جائز نہیں

مفتی رشید احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ پتنگ بازی کی شرعی حیثیت بیان فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''۱:..... رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو کبوتر کے پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھا تو فرمایا: یہ شیطان ہے اور شیطانہ کا پیچھا کر رہا ہے۔ (ابوداؤد، ج:۲، ص:۱۷۶)

کبوتر بازی میں انہماک کی وجہ سے امور دینیہ و دنیویہ سے غفلت کا مفسدہ پتنگ بازی میں بھی پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ وعید اس کو بھی شامل ہے۔

۲:..... مسجد کی جماعت بلکہ خود نماز سے ہی غافل ہو جانا، شراب اور جوئے کے حرام ہونے کی اللہ تعالیٰ نے یہی وجہ بیان فرمائی ہے: وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ۔

۳:..... پتنگ اکثر مکانوں کی چھت پر کھڑے ہو کر اُڑائے جاتے ہیں، جس سے

آس پاس والے گھروں کی بے پردگی ہوتی ہے۔

۴:.....بعض اوقات پتنگ اُڑاتے اُڑاتے پیچھے کو ہٹتے ہیں اور نیچے گر جاتے ہیں، چنانچہ اخبارات میں اس قسم کے واقعات شائع ہوتے رہتے ہیں۔اس میں اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔حضور اکرم ﷺ نے ایسی چھت پر سونے سے منع فرمایا ہے جس پر آڑ نہ ہو۔

۵:.....بے جا مال صرف کرنا تبذیر اور حرام ہے، قرآن کریم میں ایسے لوگوں کو شیطان کے بھائی قرار دیا گیا ہے۔

پتنگ بازی کا باہم مقابلہ معصیت میں تسابق و تفاخر ہے جو حرام ہے اور اس پر کفر کا خطرہ ہے۔واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔ (احسن الفتاویٰ، ج:۸،ص:۱۷۶)

پتنگ بازی کی خرابیاں

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''اصلاح الرسوم'' میں پتنگ بازی کی مندرجہ ذیل خرابیاں بیان کرتے ہیں:

''اب کنکوے (پتنگ) کی نسبت بھی سن لیجیے! جس قدر خرابیاں کبوتر بازی میں ہیں، قریب قریب اس میں بھی موجود ہیں:

۱:.....کنکوے (پتنگ) کے پیچھے دوڑنا، جس میں پیغمبر ﷺ نے کبوتر کے پیچھے دوڑنے والے کو شیطان فرمایا۔

۲:.....دوسرے کے کنکوے (پتنگ) کو لوٹ لینا، جس کی ممانعت حدیث شریف میں صراحتاً وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''نہیں لوٹتا کوئی شخص ایسا لوٹنا جس کی طرف لوگ نگاہ اٹھا کر دیکھتے ہوں اور پھر بھی وہ مؤمن رہے۔'' (بخاری، مسلم) یعنی یہ خصلت ایمان کے خلاف ہے۔

۳:.....ڈور کو لوٹ لینا، اس میں پتنگ لوٹنے سے بھی زیادہ قباحت ہے، کیونکہ پتنگ تو ایک ہی ہاتھ میں لگتی ہے اور وہی گناہگار ہوتا ہے، جب کہ ڈور تو بیسیوں آدمیوں کے ہاتھ لگتی ہے اور سب گناہگار ہوتے ہیں اور اس کا سبب وہی پتنگ باز ہے۔

۴:.....ہر شخص کی نیت یہ ہوتی ہے کہ دوسرے کی پتنگ کاٹوں اور اس کا نقصان کروں تو مسلمان کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔

۵:.....نماز سے غافل ہو جانا، جسے اللہ نے شراب اور جوئے کے حرام ہونے کی علت بتلایا ہے۔

۶:.....اکثر کوٹھیوں کی چھتوں پر کنکوے اُڑانے سے آس پاس والوں کی بے پردگی ہوتی ہے۔

۷:.....بعض اوقات کنکوہ چڑھاتے وقت پیچھے کو ہٹتے جاتے ہیں اور کوٹھے سے نیچے

گر پڑتے ہیں۔

۸:.....ایک خاص خرابی یہ ہے کہ آلۂ علم کی توہین ہوتی ہے، کیونکہ گڈی کاغذ سے بنتی ہے۔

۹:.....ان سب کھیلوں میں مال مفت کا ضائع ہوتا ہے اور فضول خرچی کا حرام ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ (بسنت کیا ہے؟ ص: ۷۸-۷۹)

بسنت ایک گستاخ رسول کی یادگار

مشہور سکھ مؤرخ بی ایس نجار لکھتے ہیں:

''بسنت کا میلہ جنوری میں ''حقیقت رائے'' کے مرگھٹ پر منعقد ہوتا تھا جو کہ کوٹ خواجہ سعید نامی گاؤں کے قریب ہے، یہ میلہ سرسوں کے پھول پھلنے پھولنے کے موسم میں قائم ہوتا تھا اور اس کے منانے والے زرد پوشاک اوڑھتے اور اس میں سرسوں کے پھول اُگاتے تھے۔ یہ میلہ ''حقیقت رائے'' کی موت کی یادگار تھا جو کہ سیالکوٹ کے کھتری خاندان کے ''باغ مل'' کا اکلوتا بیٹا تھا، اس کی موجودگی میں ایک لڑکے نے اپنے استاد کے سامنے ہندو اوتاروں کے متعلق کچھ ناشائستہ الفاظ کہے، جو ان ''حقیقت رائے'' (المولد: ۱۷۱۹ء) یہ برداشت نہ کرسکا اور اس نے ردعمل کے طور پر حضور اکرم ﷺ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں سخت گفتگو کی، پس لاہور میں ایک ڈرامائی کھیل کھیلا گیا اور اُسے موت کے فیصلے تک پہنچا دیا گیا، پھر ''حقیقت رائے'' کو ایک ستون سے باندھا گیا اور اس وقت تک مارا گیا، جب تک اس کی جان نہ نکلی، اس کی یہ موت ۱۷۳۴ء میں ہوئی، اس وقت پنجاب کی تمام غیر مسلم آبادی ''حقیقت رائے'' کی موت پر رو رہی تھی۔'' (پنجاب آخری مغل دورِ حکومت میں، ص: ۲۷۹)

سید محمد لطیف اپنی کتاب ''تاریخ لاہور'' میں لکھتے ہیں:

''سمادھ ''حقیقت رائے'' لاہور سے دو میل کے فاصلہ پر مشرقی جانب موضع کوٹ خواجہ سعید کے مشرق میں واقع ہے۔ ''حقیقت رائے'' سترہ سال کی عمر کا ایک ہندو لڑکا تھا، وہ حاکم لاہور نواب خان بہادر کے دور میں ایک مدرسہ میں پڑھتا تھا، اس کا مسلمان لڑکوں سے جھگڑا ہوگیا اور اس نے ان لڑکوں کی طرف سے دیوتاؤں کے لیے ناشائستہ زبان استعمال کرنے کے ردعمل کے طور پر جواباً اسی قسم کے کلمات کہہ ڈالے، اس کو قاضی کے پاس لے جایا گیا، اس نے پیغمبر کے خلاف ناشائستہ زبان استعمال کرنے پر اس کو سزائے موت سنادی۔ یہ معاملہ حاکم لاہور کے سامنے پیش ہوا، تاہم اس نے قاضی کے فیصلے کی توثیق کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ اگر یہ لڑکا اسلام قبول کرلے تو اس کی سزا معاف ہوسکتی ہے۔ ''حقیقت رائے'' اپنے آباء واجداد کے مذہب پر خلوص دل سے کار

بند تھا، اس نے دین اسلام کی دعوت کو رد کر دیا اور پھانسی چڑھ گیا، ہندو اس کے مقبرے کی بہت زیادہ تعظیم کرتے ہیں اور کثیر تعداد میں جا کر اس کے آگے سر جھکاتے ہیں، اسی سادھ پر بسنت بہار کا میلہ منعقد ہوتا ہے۔'' (تاریخ لاہور، ص:۲۳۴)

ڈاکٹر انجم رحمانی لکھتے ہیں:

''حقیقت رائے'' بھی سیالکوٹ کے باغ مل کا بیٹا تھا، جسے بسنت پنچمی کے دن مارا گیا، اس کی سادھی لاہور میں بنائی گئی تھی اور تقسیم ملک کے وقت سے وہاں پر ہر سال بسنت پنچمی کے موقع پر بڑا زبردست میلہ لگتا تھا۔ اس کے ذریعے پنجاب کے لوگوں کو یہ سبق سکھایا جاتا ہے کہ ''حقیقت رائے'' کی طرح تعصب اور ناانصافی کے آگے ہتھیار ڈالنے کے بجائے جان دینا بہتر ہے۔'' (پنجاب، تمدنی ومعاشرتی جائزہ، ص:۴۲۶)

بسنت منانے والے مسلمان سوچیں کہ ہندو اس کے ذریعے کیا سبق پڑھانا چاہتا ہے؟

نذیر احمد چوہدری لکھتے ہیں:

''لاہور میں بسنت کو بطور تہوار منانے کا آغاز ۱۷۴۷ء میں ہوا، ایک روایت کے مطابق ایک ہندو لڑکے ''حقیقت رائے دھرمی'' کی سادھی پر ہندوؤں نے پیلے رنگ کے کپڑے پہن کر حاضری دی۔ حقیقت رائے نامی جوان کا تعلق سیالکوٹ سے تھا، وہ اس وقت کے رواج کے مطابق مسلمانوں کے ساتھ تعلیم حاصل کرتا تھا، مکتب میں کسی بات پر اس کا جھگڑا کسی مسلمان طالب علم سے ہو گیا جس کے بعد حقیقت رائے نے حضور نبی اکرم ﷺ کی شان میں گستاخی کی، چنانچہ یہ مقدمہ لاہور کے ایک قاضی کی عدالت میں پیش ہوا۔ دوران مقدمہ ہندوؤں نے یہ مؤقف پیش کیا کہ مسلمان طالب علم نے پہلے ان کے اوتاروں کو برا بھلا کہا تھا، مگر وہ قاضی کو دلائل سے قائل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ قاضی نے حقیقت رائے کو سزائے موت سنا دی، چنانچہ ۱۷۴۷ء میں اُسے لاہور میں پھانسی دے دی گئی، جس جگہ اسے پھانسی دی گئی وہ گھوڑے شاہ (باغبانپورہ) کے علاقے میں تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک حقیقت رائے نے ہندو دھرم اور اوتاروں کے لیے قربانی دی تھی، اس لیے انہوں نے اس دن گستاخ رسول کی یاد منانے کے لیے رنگ بکھیرا، پتنگ بازی کی اور اس کا نام بسنت رکھا۔ بعد میں اس مقام پر ایک مندر تعمیر کیا گیا، جہاں اس کی موت کے دن ہندو مرد زرد رنگ کی پگڑیاں اور عورتیں زرد رنگ کی اوڑھنیاں پہن کر حاضری دیتیں اور منتیں مانتی تھیں۔'' (بسنت لاہور کا ثقافتی تہوار، ص:۱۶)

ان تحریرات کی روشنی میں یہ بات بالکل کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ بسنت ایک خالص ہندوانہ تہوار ہے۔ ہندو ایک گستاخ رسول کی یاد مسلمان حکمرانوں کے ڈر سے کھلے عام نہ منا سکے، لہٰذا انہوں نے چھپ چھپا کر خاموشی سے ''حقیقت رائے'' کی سادھ پر بسنت میلے کا آغاز کر دیا اور آج

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اتنے روشن تاریخی حقائق کے باوجود مسلمان بسنت منانے میں ہندوؤں کے قدم بہ قدم شریک ہیں۔ مسلمان اس غیرت مند قاضی کی تاریخ تو محفوظ نہ رکھ سکے، اس کی کوئی یادگار قائم نہ کر سکے، جس نے اس گستاخ کو موت کے گھاٹ تک پہنچانے کے لیے جرأت مندانہ فیصلہ دیا۔ اس استادِ مکتب کا نام بھی تاریخ کے اوراق میں ڈھونڈے نہیں ملتا، جس نے اس گستاخ کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا۔ ہندوؤں نے محض اس لیے ''حقیقت رائے'' کی تاریخ محفوظ رکھی اور اس کی یادگار قائم کر لی کہ وہ ہمارے نبی کریم ﷺ کا گستاخ تھا۔ آج المیہ یہ ہے کہ ہم بھی ہندوؤں کے ساتھ ''حقیقت رائے'' یعنی گستاخ رسول کی یادگار منانے میں سرگرم نظر آتے ہیں۔

ایک گستاخ رسول کے ساتھ نفرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہم اپنے ملک سے اس یادگار کی جڑیں اُکھیڑ دیں، اگر اتنی قوت نہیں تو کم از کم خود کو اس آگ سے دور رکھیں۔

اسلامی معاشرے پر ہندو تہذیب کے اثرات کیسے پڑے؟

دسویں صدی ہجری میں تاریخ اسلامی کے پہلے ان پڑھ بادشاہ جلال الدین اکبر نے فضل اور فیضی جیسے درباری ملاؤں کے اضلال پر ''دین الٰہی'' کی بنیاد رکھی اور اسلام کی اصل تصویر کو مسخ کر دیا۔ اس کی دیگر خرابیوں کے ساتھ ساتھ ایک واضح خرابی یہ تھی کہ اس نے ہندو لڑکیوں سے شادی کو حلال قرار دیا تھا۔ اکبر بادشاہ نے اس کا آغاز اپنی ذات سے کیا اور راجہ ''بہاری مل'' کی بیٹی اور راجہ ''بھگوان داس'' کی بہن کو اپنے حرم میں داخل کر دیا۔ کچھ عرصے بعد اس نے ریاست جودھ پور کی رانی جودھ بائی سے شادی رچا لی۔ ان ہندو رانیوں نے اکبر کے حرم میں داخل ہو کر قصر سلطانی کو ہندوانہ رسم و رواج کا اکھاڑا بنا دیا۔ دین اکبری کے پیروکاروں نے اپنے بادشاہ کی اقتدا کی اور دھڑا دھڑ ہندو لڑکیاں ان کے آنگنوں میں آ بیٹھیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہندوانہ رسم و رواج، تہوار اور میلے مسلمان کہلانے والوں کے گھروں میں باقاعدہ منائے جانے لگے۔ یہیں سے ہمارے معاشرے میں ان بے ہودہ رسموں کی داغ بیل پڑی، اس سلسلے کو مزید ترقی ملی اور رفتہ رفتہ ہندو مذہب کے خاص خاص شعائر یعنی گائے ذبح کرنے کی ممانعت، داڑھی منڈوانا، آفتاب کے رخ بیٹھ کر جھروکا درشن، بھدرا کروانا اور قشقہ لگوانا بھی دین اکبری کے لازمی اجزا بن گئے جو سرکاری طور پر نافذ کر دیئے گئے۔

مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کی قربانیوں سے دین اکبری کا سورج غروب ہوا تو ہندوانہ عقائد بھی اسلامی معاشرے سے دم توڑ گئے، لیکن بعض رسومات اور مخلوط میلوں ٹھیلوں کا زہر کسی نہ کسی درجے میں بہرحال باقی رہا، اس کے علاوہ قصبوں دیہاتوں میں ہندو مسلم اکٹھے رہتے تھے، جہاں بہت سی ہندوانہ توہمات اور رسومات نے اسلامی تہذیب پر اپنا اثر چھوڑا۔

اسلامی معاشرے میں بسنت کا آغاز

بسنت کے بارے میں چونکہ یہ بات تاریخی شواہد سے ثابت شدہ ہے کہ یہ ''حقیقت رائے'' کی

موت سے قبل بھی ہندوؤں کا ایک موسمی میلہ تھا اور ''حقیقت رائے'' کے عبرتناک انجام کے بعد تو اسے خالص مذہبی رنگ مل گیا تھا، لیکن اس کے باوجود تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہوجاتی ہے کہ اس کا اثر گزشتہ تمام ادوار میں مسلمان معاشرے کے اندر رہا ہے، بسنت کے اثرات مسلمان معاشرے میں کیسے داخل ہوئے؟ آیئے! تاریخ کی روشنی میں پڑھتے ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے بھی بسنت منانا شروع کیا اور اس کی ابتدا اس طرح بتائی جاتی ہے کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کے محبوب بھانجے مولانا تقی الدین نوح کا عین شباب میں انتقال ہوگیا، حضرت خواجہؒ کو اس سے بڑا صدمہ پہنچا، چھ مہینے تک مہر سکوت طاری رہی، اس کی وجہ سے امیر خسرو بھی مغموم رہتے تھے اور برابر اس فکر میں رہتے تھے کہ کس طرح مرشد کا غم غلط ہو، بسنت کا میلہ تھا، ہندو دہلی میں کالکا جی کے مندر پر سرسوں کے پھول چڑھا رہے تھے اور مست ہوکر ترانے الاپ رہے تھے، خسرو بھی اس کو دیکھ کر بے خود ہوگئے، فارسی اور ہندی کے چند اشعار موزوں کیے، سرسوں کے پھول توڑے اور پگڑی کو کج کر کے مستانہ شان پیدا کی اور جھومتے جھامتے اشعار پڑھتے حضرت خواجہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اس وقت بھانجے کے مزار پر تھے، امیر خسرو کی مستانہ ادا دیکھ کر اور ان کے اشعار سن کر تبسم فرمایا تو امیر خسرو کا کام بن گیا کہ شیخ کا غم وسکوت ٹوٹ گیا۔ اس روز سے دہلی میں جب ہندو کالکا جی کے مندر پر جاتے تو دہلی اور قرب وجوار کے (نام نہاد) صوفیہ قوالوں کو لے کر سرسوں کے پھول ہاتھ میں لیے اشعار پڑھتے ہوئے مولانا تقی الدین کے مزار پر جاتے ہیں اور وہاں سے حضرت خواجہؒ کے مزار اقدس پر آتے ہیں۔'' (مغل شہنشاہوں کے شب وروز، ص: ۳۴۷)

مغل دربار میں بڑی دھوم دھام سے یہ تہوار (بسنت) منایا جاتا تھا۔ اورنگزیب عالمگیر کے دور میں دربار سے اس کا رواج اٹھ گیا تھا، لیکن اس کے جانشینوں کو اس سے بڑی دلچسپی تھی، شاہزادہ عظیم الشان شان اس دن زرد لباس پہنا کرتا تھا، شاہ عالم ثانی اور بہادر شاہ ظفر کے دور حکومت میں شاہی محل میں جس شان وشوکت سے یہ جشن منایا جاتا تھا، اس کی عکاسی شاہ عالم ثانی نے خود نادرات شاہی کے اشعار میں کی ہے:

آج لے لے آئیں سب سکھی مل یہ نیکو رنگ
نئے نئے پھولن سوں کھیلن شاہ عالم کے سنگ

(ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۱۷۴)

ان تحریرات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ہندوانہ رسم ورواج کا اسلامی تہذیب وتمدن اور اسلامی معاشرے پر گہرا اثر ڈالنے میں اکابر صوفیا کی محبت اور جانشینی کا دعویٰ رکھنے والے مبتدع مزاج جدت پسندوں، روشن خیالوں اور بے لگام عیش پرست بادشاہوں کا بڑا دخل رہا ہے۔ ہندو درباروں تک خوشامدوں کے ذریعے رسائی حاصل کرتے اور پھر غافل حکمرانوں کو ان چیزوں میں

مبتلا کر دیتے۔ ان اقتباسات سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اگر کہیں اقتدار صاحب علم وعمل لوگوں کے ہاتھ میں آیا ہے تو انہوں نے امت کو اس گرداب سے چھٹکارا دلایا ہے، جیسا کہ مؤرخ نے عظیم مسلمان حکمران اورنگزیب عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے، لیکن افسوس! ان کے جانشین ان کی روایت برقرار نہ رکھ سکے۔ مصنف آگے جا کر لکھتے ہیں:

''درحقیقت ۱۸۵۷ء تک آگرہ اور دہلی کے مسلمان اور بالعموم شمالی ہند کے مسلمان یہ میلہ بڑی دھوم دھام اور جوش وخروش سے مناتے تھے۔ حیاتِ جاوید میں لکھا ہے کہ بسنت کے جو میلے ہوتے تھے، سرسید احمد خان بھی ان میں شرکت کرتے تھے۔ خواجہ فریدؒ کے مزار پر چونسٹھ کھمبے ہیں جہاں بسنت کا میلہ ہوتا تھا، اس میں وہ اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ منتظم ومہتمم ہوتے تھے۔'' (ہندوستانی تہذیب کا مسلمانوں پر اثر، ص: ۱۷۹، ۱۸۰)

معلوم ہوا کہ بسنت کے میلے کا رواج ہندوؤں کے ساتھ ساتھ ان جدت پسند مسلمانوں کے گرد بھی گھومتا رہا ہے جو دانستہ یا نادانستہ اسلامی تہذیب وتمدن کی بیخ کنی میں مصروف رہے ہیں۔

بسنت کو حقیقی پذیرائی کب ملی؟

پنجاب پر راجہ رنجیت سنگھ کی حکومت آئی تو بسنت عروج پر جا پہنچا، راجہ نے بسنت کو خوب ترقی دی، راجہ خود میلے میں شرکت کرنے آتا، وہ اور اس کے درباری زرد لباس اور پگڑیاں پہن کر ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار ہوتے، ان کا جلوس قلعہ لاہور اور شالامار باغ کی طرف روانہ ہوتا، پھر ''حقیقت رائے'' کے سمادھ پر حاضری دی جاتی، اس تمام تر راستے میں یہ جلوس سرسوں کے کھیتوں سے گزارا جاتا، تاکہ پھولوں کے ساتھ زرد لباس کی میچنگ دلفریبی کا باعث بنے۔ سید محمد لطیف نے اپنی کتاب ''تاریخ لاہور'' میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بسنت کے موقع پر مشاغل کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، جس کا حاصل یہی نکلتا ہے کہ ہندوستان میں بسنت کو سرکاری سطح پر عروج رنجیت سنگھ کے دور میں ملا۔

جشن بہاراں

جب انگریزوں نے ہندوستان میں قدم جمانا شروع کئے تو ان کی کوشش رہی کہ ایسے مقامی تہواروں کو سرکاری سرپرستی میں لیا جائے جو عوام کے اخلاق پر منفی اثر ڈالیں، تاکہ ان تہواروں کو مزید ترقی دی جا سکے اور ہندوستانی قوم کو اخلاقی طور پر مزید پاتال میں گرایا جا سکے، انہوں نے اس مقصد کے لیے بسنت کو انتہائی مناسب سمجھا۔ جان لارنس لاہور میں انگریز گورنر جنرل کا سیاسی نمائندہ تھا، اس نے سب سے پہلے ۱۸۴۸ء میں ''جشن بہاراں'' منانے کا اعلان کیا، یہ بسنت کا ہفتہ بھی کہلایا، اسی ہفتے لاہور میں ناچ گانے، پتنگ بازی اور شراب کا عام استعمال ہوا، اس ہفتے ان تمام تر جرائم کو ناقابل دست اندازی پولیس قرار دیا گیا۔ مؤرخین کے مطابق اس دن لاہور کے شرفا گھروں تک محدود رہے اور انہوں نے باہر بالکل قدم نہیں رکھا، تاکہ گلی کوچوں میں شراب کے نشے

میں دھت غنڈوں کی بدتمیزی کا شکار نہ ہو جائیں۔ جان لارنس کے ۱۵۴ سال بعد ۲۰۰۲ء سے ایک دفعہ پھر لاہور میں شہری سطح پر بسنت منانے کا رواج پڑ گیا ہے۔

ایک اخباری رپورٹ کے مطابق گزشتہ صدی میں ۸۰ء کی دہائی کے آخر تک پتنگ بازی یا بسنت صرف لاہور تک محدود تھی یا قصور میں کسی حد تک لوگ اس کا شوق رکھتے تھے، لاہور میں بھی اُسے شرفا کا مشغلہ قرار نہیں دیا جاتا تھا، مگر ۸۰ء کی دہائی میں اس کھیل نے زور پکڑا اور اہل لاہور اسے ایک تفریح کے طور پر منانے لگے۔ اندرون شہر کے بعض محلوں میں بسنت کو عید کی طرح ایک تہوار کی حیثیت حاصل ہے اور لوگ اس موقع پر ایک دوسرے کو تحفے تحائف دیتے ہیں، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بہو بیٹیوں کو عیدی کی طرح بسنت پر بھی رقم دیتے ہیں، اس روایت کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے، ۸۰ء کی دہائی کے آخر تک بسنت کے موقع پر پتنگ بازی اور زیادہ سے زیادہ کسی مکان کی چھت پر لائٹنگ اور اسپیکر کا بندوبست ہو جایا کرتا تھا، باجے بجتے تھے، بوکاٹا کے نعرے لگتے تھے، بھنگڑا ڈالا جاتا تھا، کھانے پکتے تھے اور بس۔

۹۰ء کی دہائی کے اوائل میں نائٹ بسنت نے رواج پکڑا، فلڈ لائٹس آئیں، مگر صرف چند دولت مند افراد کی چھتیں ہی روشن ہوا کرتی تھیں، جہاں رات بھر موسیقی کا طوفان بپا رہتا اور پتنگیں اڑائی جاتیں، اہل محلہ کبھی ایسے ماحول کو برداشت نہیں کرتے تھے، بلکہ ایسا کرنے والوں کو چھچھورا اور نو دولتیا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ انہی ایام میں ہوائی فائرنگ کی رسم بھی اس تفریح میں شامل ہوگئی اور اس طرح سے نام نہاد تہوار عذاب بننے کی طرف گامزن ہوگیا۔ مگر اس دور میں پولیس بہرحال متحرک رہا کرتی تھی، سیڑھیاں لگا کر چھتوں پر چڑھنا اور فائرنگ کرنے والوں کی پکڑ دھکڑ ہوتی تھی، اگلی صبح لوگ تبصرے کرتے کہ فلاں کے گھر چھاپہ پڑا، فلاں گرفتار ہوا، وغیرہ وغیرہ، فائرنگ کے باوجود یہ تہوار ہلاکت خیز یا یوم قتل عام نہیں بنتا تھا، وجہ یہ تھی کہ پتنگ اڑانے کے لیے استعمال ہونے والی ڈور زیادہ سے زیادہ نائیلون کی ہوتی تھی، عمومی ڈور پر باریک پسا ہوا کانچ اور بے ضرر اشیا کلی ہوتی تھیں، جو پتنگ بازوں کی انگلیوں پر ہلکے چرکے تو لگا دیتی تھی، مگر گلے نہیں کاٹا کرتی تھی۔

بسنت کے قتل عام میں بدلنے کا آغاز اکیسویں صدی کے آغاز سے ایک دو سال قبل ہوا اور اسے مزید ترقی اس وقت ملی جب دوستی بس سروس نے پاک بھارت آمدورفت میں آسانی پیدا کی، ہوا یہ کہ بھارت سے خصوصی قسم کی ڈور منگوائی جانے لگی جس کو کانچ کے ساتھ لوہے کے برادہ سے آلودہ کیا ہوا ہوتا تھا۔ پہلی بار یہ ڈور ۲۰۰۱ء میں پاکستان آئی اور لاہور میں ایک دن کے اندر ۳۰ افراد ذبح کر گئی، اس ڈور کے آنے سے پتنگ بازی کا رنگ و رقص والا تہوار خون سے بھی آلودہ ہوگیا، جس پر ہر شخص چیخ رہا ہے۔ ۲۰۰۲ء میں اسے سرکاری سرپرستی میں منایا گیا اور اس وقت پاکستان کے سربراہ پرویز مشرف اسے ترقی دینے میں پیش پیش تھے، لہٰذا اس کے بعد سے یہ بسنت کھلی لاقانونیت، قتل و خونریزی اور فحاشی و عریانی کا ایک بہت بڑا ذریعہ بن گیا ہے۔ اب فائرنگ،

ہاؤ ہو اور ہر چھت پر موسیقی کا طوفان ہی نہیں، بلکہ باقاعدہ مجروں نے رواج پکڑ لیا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے بعد سے لاہور کے ہر بڑے ہوٹل یا پلازہ کی چھت پر مجرے ہوتے ہیں، ملک بھر کی بازاری عورتیں ناچتی گاتی اور گل کھلاتی رہتی ہیں، شراب و کباب کی محفلیں کھلے عام سجتی ہیں، چھتوں کے اوپر آوارہ گرد مخلوق بوکاٹا کے نعروں میں جشن منا رہی ہوتی ہے اور نیچے پتنگ کے دھاتی ڈوریں معصوموں کے جسم و جاں سے کھیل رہی ہوتی ہیں۔

چونکہ پتنگ باز دھاتی تار استعمال کرتا ہے، لہٰذا اس تار کی پتنگ جیسے ہی بجلی کی تاروں پر گرتی ہے فیڈر ٹرپ کر جاتا ہے، کئی زندگیاں ضائع ہو جاتی ہیں، بعض اوقات ٹرانسفارمر اُڑ جاتے ہیں، اور کبھی کبھی گرڈ اسٹیشن تک کو نقصان پہنچ جاتا ہے، جھٹکوں کی وجہ سے بجلی کی بار بار بندش ہوتی ہے جس کی وجہ سے صارفین کے فریج، مشینیں اور دیگر برقی آلات جل جاتے ہیں۔ منانے والوں کے ذہن میں پتہ نہیں اتنی واضح بات کیوں نہیں آتی کہ یہ کیسی تفریح ہے؟ جس میں دوسروں کے اموال اور زندگیوں کے ساتھ کھیلا جا رہا ہے، حالانکہ یہ تفریح نہیں بلکہ وہ عفریت ہے جو ہر سال پاکستان کے مظلوم شہریوں پر بدعقل ارباب بست و کشاد کی طرف سے مسلط کر دیا جاتا ہے اور وہ مظلوم عوام کا خون چوس لیتا ہے۔

بسنت ایک گستاخ رسول کی یاد میں منائی جانے والی رسم ہے۔ بال ٹھاکرے جیسے متعصب اور اسلام و پاکستان دشمن ہندو پاکستان میں بسنت کے انعقاد کو ہندوؤں کی عظیم کامیابی کہا کرتے تھے۔ مقام عبرت ہے ہمارے حکمرانوں اور بدعقل پتنگ بازوں کے لیے کہ وہ مسلمان کہلانے کے باوجود اپنے پیارے نبی ﷺ کے گستاخ کی یادگار مناتے ہیں، الامان والحفیظ۔

ایک طوفان بدتمیزی برپا ہے، ذرا سوچئے تو سہی! ہمارا ملک کہاں کھڑا ہے؟ جس ملک کی نصف سے زیادہ آبادی ان پڑھ ہو، جس ملک کے اسی فیصد باسی صاف پانی پینے کے لیے ترس رہے ہوں، جس ملک کے ہسپتال بنیادی سہولتوں سے محروم ہوں، جس ملک کے نوجوان بے روزگاری کی وجہ سے خودکشیاں کر رہے ہوں، جس ملک کو چاروں طرف سے دشمن گھیر چکا ہو، جس ملک کے گلی کوچے قتل و غارت گری کے بازار بن چکے ہوں، جس ملک میں لوٹ کھسوٹ، بددیانتی، بدامنی اور پولیس گردی عام ہو، جس ملک کا غریب سبزی اور دال خریدنے کی سکت نہ رکھتا ہو اور جس ملک کا بچہ بچہ قرضوں کے بوجھ تلے دب کر سسک رہا ہو، اس ملک کے باسیوں کا بسنت جیسے تہواروں پر خزانوں کے منہ کھول کر یوں رقم بہانا اپنی قوم کو ذبح کرنا نہیں تو اور کیا ہے؟ کون بے وقوف ہوگا جو اُسے امیج بہتر کرنے کا سبب کہے گا؟ کون ہوگا جو ایسی صورتحال میں بسنت جیسی واہیات رسموں کو روشن خیالی سے تعبیر کرے گا؟ شاید اس سے بڑھ کر تاریک خیالی کا تو کہیں وجود ہی نہ ہو۔ اللہ رب العزت سے دعا ہے کہ مسلمانانِ پاکستان کو بسنت جیسی قبیح رسموں سے نجات دلائے اور ہنود و یہود کی مسلط کردہ تہذیب کو پرے پھینکنے کی توفیق دے۔ آمین ثم آمین۔